ارض و سما

احمد ندیم قاسمی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.51 Qasmi, Ahmad Nadeem
Arz-o-Samaa/ Ahmad Nadeem
Qasmi.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2007.
160pp.
1. Urdu Literature - Poetry.
I. Title.

2007
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

سرورق ——— نفیسہ حیات قاسمی

فوٹوگراف ——— نیّر حیات قاسمی

ISBN 969-35-1919-1

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore, Pakistan, Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

نسلِ نَو کے نام

ندیؔم میرے جِلو میں تھی نسلِ مُستقبل
میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا

(احمد ندیؔم قاسمی)

فہرست

پیش لفظ

میرے اباّ جی اور ہم سب کے احمد ندیم قاسمی کی اِس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقلی کے بعد میں اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ اُن کی ہمہ جہت اور نَو بہ نَو تخلیقات کو جلد از جلد کتب کی صورت میں شائع کروا کر محفوظ کر دوں۔ اور اس طرح آپ کی امانت آپ تک پہنچا دوں۔

اپنے اباّ جی کے ساتھ گزارے آخری دنوں میں، گھر پر موجود اُن کی الماریوں میں رکھے کاغذات اور خطوط، مَیں نے اُن کی رہنمائی میں ترتیب دے کر الگ الگ فائلوں اور لفافوں میں رکھ دیئے۔ انہوں نے اس سے مطمئن ہو کر طے کیا کہ میں جلد ہی اُن کے دونوں دفتروں میں موجود کاغذات وغیرہ بھی اسی طرح اُن کی رہنمائی میں ترتیب دوں گی۔ ۸، جولائی کو ہسپتال جانے سے قبل تک اباجی نے رسالہ ''فنون'' آدھے سے زیادہ کمپوز کروالیا تھا، کچھ حصہ کمپوزنگ کے لیے دے رکھا تھا اور باقی کا انتخاب کر رہے تھے۔ سرورق کے متعلق ہدایت بھی دے دی تھی۔ جبکہ ان کے کلام کا نیا مجموعہ اور ان کے تحریر کردہ سوانحی خاکوں کی نئی کتاب، دونوں شائع ہونے کیلئے تیار تھیں (وہ اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ ''پت جھڑ'' بھی مرتب کر رہے تھے)۔ ۶ر جولائی کی شام کو اباّ جی نے مجھ سے ان کی ابتدائی فہرستیں بنوائیں تا کہ ہم دیکھ سکیں کہ ۱۹۹۵ء سے اب تک کی کوئی غزل یا نظم شامل ہونے سے رہ تو نہیں گئی۔ ایسی چند ہی چیزیں تھیں جو فہرست میں شامل نہیں تھیں۔ اب میں نے اپنی حتی الامکان رسائی سے کام لے کر فہرست کو تاریخوں کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ اباّ جی کی عادت تھی کہ وہ جب بھی اپنی نظم یا غزل مکمل کر لیتے تو اُس کے آخر میں اپنا نام اور تاریخ

ضرور درج کرتے۔ اُن کے کاغذات میں سے خود ان کی تحریر کی ہوئی کچھ نظمیں اور غزلیں نامکمل بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ اُن پر اُن کے دستخط اور تاریخِ تخلیق تحریر نہیں ہے مثلاً یہ درج ذیل معنی خیز، فکر انگیز نظم غالباً ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی:

میں کسے بتاؤں کہ یہ جو ایک درخت کی کسی شاخ پر
کوئی اک پرندہ ہے نغمہ زن
تو یہ کون ہے
یہ صدا زمیں کی صدا نہیں
کہ یہ وہ صدا ہے جو کائنات کی ابتداء میں
کسی خلا سے دَر آئی تھی
یہی وہ صدا ہے جو ''کُن'' بنی
تو خلا میں کُرّے بکھر گئے
یہی وہ صدا ہے کہ جس کی گونج
دِلوں میں نُور بسا گئی

اِسے ابھی کوئی عنوان نہیں دیا گیا تھا۔ میں نے ندیم کی ایسی تخلیقات اس مجموعے میں شامل نہیں کیں تا کہ اباّجی کا انتخاب اور ان کی دی ہوئی ترتیب برقرار رکھی جا سکے۔

اباّجی نے اپنے اس مجموعے کا عنوان پہلے ''برملا'' سوچا تھا، لیکن بوجوہ، وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ میں جب بھی اُن سے پوچھتی کہ کون سا عنوان فائنل کیا؟ تو وہ سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ یہ تو انہوں نے اپنے جانے سے صرف ایک روز پہلے ۹، جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح کو ہسپتال میں اپنی نواسی نفیسہ حیات قاسمی کا ہاتھ پیار سے تھام کر ہمیں بتایا تھا کہ نفیسہ نے اپنے ایم ایف اے (فائن آرٹس) کیلئے جو ندیم کے اشعار کے افکار سے متاثر ہو کر اپنا پینٹنگ تھیسز حال ہی میں مکمل کیا تھا، تو اُس میں شامل اُن ہی کے ایک شعر نے انہیں نیا عنوان سُجھا دیا تھا۔ ''ارض وسما'' ــــــ سو اِس مجموعے کا یہ نام خود احمد ندیم قاسمی کا دیا ہوا ہے۔ اُنہوں نے اُسی وقت مجھے کتاب کے شروع میں اپنا یہ شعر درج کر دینے کی بھی خاص طور پر

ہدایت کی تھی۔

اِس مجموعے کے آخر میں احمد ندیمؔ قاسمی کے جامع سوانحی کوائف بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔اس مجموعے کے جملہ حقوقِ اشاعت واخذ وترجمہ احمد ندیم قاسمی کے اکلوتے بیٹے نعمان ندیم قاسمی کے حق میں محفوظ ہیں۔

آپ سے استدعا ہے کہ اگر اِس مجموعے کے مطالعے کے بعد آپ محسوس کریں کہ ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۶ء تک کے عرصے کی ندیمؔ کی کوئی غزل یا نظم اس میں شامل نہیں ہو سکی تو اس کی فوٹو کاپی ہمیں بھجوا کر ممنون فرمائیں تاکہ دوسری اشاعت میں انہیں شامل کیا جا سکے۔میں اور میرا بھائی نعمان ـــــ ادارہ ''سنگِ میل پبلی کیشنز'' کے نیاز احمد صاحب اور افضال احمد صاحب کے تعاون کے بے حد شکر گزار ہیں۔ہم محمد حیات قاسمی صاحب کے مشورے اور مدد کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ناہید قاسمی

۲۱-غالب کالونی، سمن آباد، لاہور۔

۱۰،ستمبر ۲۰۰۶ء

؎ مجھ کو اِمکان کے روزن سے نظر آتے ہیں
نِت نئے ارض و سما، ارض و سما سے آگے

(ندؔیم)

حمدیہ

مجھے رنگ دے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

تو جو مہر و ماہ کی کائنات کا حسن کارِ عظیم ہے
تو جدید سے بھی جدید ہے، تو قدیم سے بھی قدیم ہے
مجھے رنگ دے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

تو حسیب بھی، تو حفیظ بھی، تو رحیم بھی، تو کریم ہے
تو بصیر بھی، تو نصیر بھی، تو کبیر ہے، تو حلیم ہے
مجھے رنگ دے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

تو مرے خیال کے گلشنوں میں بسا مثالِ شمیم ہے
تو مرے یقین کی وسعتوں میں خرامِ موجِ نسیم ہے
مجھے رنگ دے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

تو جمال بھی، تو جمیل بھی، تو خبیر ہے، تو علیم ہے
یہ حروف تیری امانتیں، یہ ندیم تیرا ندیم ہے
مجھے رنگ دے

مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

(۲۲ر دسمبر ۱۹۹۵ء)

O

انسان کی دانش کا اتنا سا خلاصہ ہے
ماضی کا اندھیرا ہے ، فردا کا اُجالا ہے

قدرت کے کرشمے ہیں ، فطرت کا تماشا ہے
ہر پیڑ فرشتہ ہے ، ہر پھول صحیفہ ہے

یہ دَورِ ترقی ہے یا حبس کا صحرا ہے
جھونکا بھی دبے پاؤں ، ڈرتا ہوا چلتا ہے

نغمے کا سا پیکر ہے ، خوشبو سے نقوش اس کے
خوابوں کے جھروکوں سے میں نے جسے جھانکا ہے

دعویٰ ہے تجھے واعظ! کیوں قربِ خدائی کا
تو نے اُسے سوچا ہے ، میں نے اُسے سمجھا ہے

دل ہے کہ الاؤ ہے ، سانسیں ہیں کہ شعلے ہیں
ہر وقت مرے اندر جیسے کوئی جلتا ہے

(اکتوبر ۱۹۹۵ء)

آؤ جینے کی کوشش کریں

آؤ، جینے کی کوشش کریں
زندگی، موت کی طرح اِک بار ملتی ہے
اِک بار جی بھر کے جی لیں
حسن وزیبائی کو اپنی آنکھوں سے پی لیں
عشق سے دل کی کھیتی کو سیراب کر لیں
شعر ونغمہ سے روحوں کو شاداب کر لیں
آؤ، جینے کی کوشش کریں
اور جی بھر کے جی لیں
موت آئے تو ہم زندگی کا سفر ختم کرنے کو تیار بیٹھے ہوں
کوئی تمنا ادھوری نہ ہو
یعنی کچھ اور جینا ضروری نہ ہو
موت یوں آئے، جس طرح انسان کو سانس آتی ہے

آئے
ہمیں جس طرف چاہے، لے جائے
جنت ہو، دوزخ ہو، برزخ ہو، کچھ بھی ہو
ہم اس طرح کی کئی جنتوں، دوزخوں، برزخوں سے گزرتے رہے
موت آئندہ بھی ہم کو ایسے ہی مانوس منظر دکھائے
تو بے شک دکھائے
کہ ہم ان کے عادی ہیں
جب ہست اور نیست کا آسماں ایک ہے
تو چلو، چند لمحوں کو کچھ اور جینے کی کوشش کریں
زندگی، موت کی طرح اِک بار ملتی ہے
اِک بار جی بھر کے جی لیں!

(نومبر ۱۹۹۵ء)

O

میں تیرا حسن نہ ڈھلنے دوں گا
وقت کی ایک نہ چلنے دوں گا

کسی لمحے کو ، کسی گردش کو
تجھ سے آگے نہ نکلنے دوں گا

عشق کی حدّتِ بے پایاں میں
دل جو پگھلا تو پگھلنے دوں گا

لغزشیں میری توانائیاں ہیں
خود کو اِک پل نہ سنبھلنے دوں گا

میں اُمیدوں کے شجر کیوں کاٹوں
میں اُنہیں پھولنے پھلنے دوں گا

(مارچ ۱۹۹۶ء)

O

میں راہِ قلندری کا راہی — رکھ پاس غرورِ پادشاہی

تاریخ میں سر کٹے پڑے ہیں — راس آئی ہے کس کو کجکلاہی

آغازِ جہاں گناہِ آدم — یعنی ہے گناہ، بے گناہی

میں صبح کی سلطنت کا پرچم — یہ کہتی ہے رات کی سیاہی

تخلیق کا پھر جواز کیا ہے — محشر ہے اگر فقط تباہی

موسیٰ نہ سہی، ندیمؔ تو ہوں

مجھ کو بھی دِکھائی دے، الٰہی!

(جون ۱۹۹۶ء)

O

جس کو اِک پھول سے بھی پیار نہیں
زندہ رہنے کا سزاوار نہیں

وقت کے ساتھ مَیں کیوں کر نہ چلوں
میرے بس میں مری رفتار نہیں

میری تدبیر ہے رازق میری
کچھ بھی تقدیر سے درکار نہیں

موت کی وجہ بتا دے کوئی
مجھ کو جینے پہ تو اصرار نہیں

کس نے خورشید کو محبوس کیا
دُور تک صبح کے آثار نہیں

جھانکتا رہتا ہوں مستقبل میں
دھند میں کچھ بھی نمودار نہیں

وہ بھی تو مجھ سا ہے آدم زادہ
میں تو دشمن سے بھی بیزار نہیں

اُس کے اعمال ہیں شاہد، کہ ندیم
صرف کافر ہے، گنہگار نہیں

(جولائی ۱۹۹۶ء)

رات

آج صبح ہوتے ہی
رات میرے پاس آئی
اپنے گھُپ اندھیرے کی
کینچلی اُتار آئی
مسکرائی اور بولی
مجھ کو غور سے دیکھو
دھوپ کی تمازت میں
میرا جسم لپٹا ہے
سورج ، ایک بچّہ سا
ڈر کے مجھ سے چمٹا ہے

اس کی جو شعاعیں ہیں
یہ میری کنیزیں ہیں
ناچتی ہی رہتی ہیں
یہ شریر چیزیں ہیں

صبح جس کو کہتے ہو
دن کی ابتدا کب ہے
یہ تو ایک وقفہ ہے
اپنا رُخ بدلنے کا
وقت کی رفاقت میں
گام گام چلنے کا
اس سفر کے رستے میں
شام ایک منزل ہے
میرا نام ہے لیلیٰ!
شام میرا محمل ہے

پھر سے میں ستاروں کی
اوڑھنی سجاتی ہوں

تیرگی کے بربط پر
چُپ کا گیت گاتی ہوں
صبح جس کو کہتے ہو
یہ ہے پیرہن میرا
ایک دن سمجھ لو گے
تم کمالِ فن میرا

(اکتوبر ۱۹۹۶ء)

O

میں جس بھی سمت سفر سے کنارا کرتا رہا
اُدھر ہی میرا ستارا اشارا کرتا رہا

فراقِ یار کی معجزنمائیاں دیکھو
کہ عمر بھر میں اُسی کا نظارا کرتا رہا

میں ایک جست میں تھا بحرِ عشق کے اُس پار
مرا رقیب فقط استخارا کرتا رہا

بحکمِ شاہ جب اظہار پر لگی قدغن
تو میرا کام مرا استعارا کرتا رہا

تمام عمر کٹی خود کو جوڑنے میں ندیمؔ
میں اپنے آپ کو خود پارہ پارہ کرتا رہا

(نومبر ۱۹۹۶ء)

میں بت تراشتا ہوں

میں بت تراشتا ہوں
میں آزرِ ادب ہوں
اور میں نے زندگی بھر
پتھر کے بت تراشے
جب میرے ہاتھ آئے
یہ پتھروں کے لاشے
بے ڈھب تھے، بے صدا تھے
یہ اَن گھڑی چٹانیں
گونگی تھیں، بے زباں تھیں

بے سَر تھیں ، بے دہن تھیں
یعنی وہ بے بدن تھیں
جب فن کا تیشہ لے کر
میں نے انہیں سنوارا
ان پتھروں نے آخر
انساں کا روپ دھارا

اور آج افق پہ میں نے
دیکھا عجیب منظر
ہاتھوں میں ہاتھ دے کر
وہ میرے پاس آئے
اپنے قدوں سے بڑھ کر
لمبے تھے ان کے سائے
اِن اَن گنت بتوں کے
تیور بہت کڑے تھے
میں نے جنہیں تراشا
پنجوں کے بل کھڑے تھے

مجھ سے بھی کچھ بڑے تھے
پھر جھرجھری سی لے کر
لب کھولنے لگے وہ
کچھ بولنے لگے وہ

میں نے سُنا کہ وہ تو
مجھ سے اُلجھ رہے ہیں
مجھ پر برس رہے ہیں
مسرور ہوں میں لیکن
گالی ہو یا دُعا ہو
کچھ بولتے تو ہیں وہ
لب کھولتے تو ہیں وہ
یہ پتھروں کے لاشے
جو میں نے ہی تراشے
لب کھولنے لگے ہیں
اب بولنے لگے ہیں

(نومبر ۱۹۹۶ء)

O

بہشت اب کوئی کیا جانے، کہاں ہے
مری جنت تو میرا خاکداں ہے

یہ دُنیا استعاروں کا جہاں ہے
مجھے گل پر فرشتے کا گماں ہے

ہر انساں موت کی جانب رواں ہے
فغاں ہے! اے میرے خالق، فغاں ہے!

نہیں یہ جذبہ منصوبوں کا محتاج
محبت میں سبھی کچھ ناگہاں ہے

اسیری، اور ندیمؔ ایسی اسیری!
جدھر بھی جاؤں سر پہ آسماں ہے

(جنوری ۱۹۹۷ء)

O

راز ہے یہ بھی کبریائی کا
آدمی پاسباں خدائی کا

درحقیقت ہبوطِ آدم ہے
اوّلیں تجربہ جدائی کا

ہفت افلاک طے کیے، لیکن
مجھ کو شکوہ ہے نارسائی کا

راستے ان کی راہ تکتے ہیں
زعم ہے جن کو رہنمائی کا

وہ کلی ہو کہ غنچہ و گل ہوں
ہے جنوں سب کو خود نمائی کا

صبح اور شام ہیں ثبوت ندیمؔ
وقت کی شانِ دِلربائی کا

(فروری ۱۹۹۷ء)

فرار

اُس نے خارج کی بوالعجبیوں سے بغاوت کے جذبے سے
باطن میں جھانکا
تو کتنے مناظر یہاں سے وہاں تک بچھے جارہے تھے
مگر سب کے چہروں پہ گہرے دھوئیں کی خراشیں تھیں
اور جتنے اشجار تھے، نامکمل تھے
اور جھاڑیاں تک ادھوری تھیں
کلیاں چٹکنے کے انجام سے باخبر لگ رہی تھی
کہ لرزہ براندام تھیں

وہ خارج سے بھاگا ہوا تھا
حقائق کا مفرور تھا
اے خدا!
اس کو باطن کے گہرے سمندر میں غوطہ لگانے کی توفیق دے
اس کو وجدان کے شیشہ شیشہ پروں پر بٹھا
اس کو ایسے دھندلکے کا رستہ دِکھا
جس میں خارج اگر خواب میں بھی نظر آئے
وہ اس کو ٹھکرائے
اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جائے

لیکن یہ کیا حادثہ ہے
کہ باطن میں بھی اس کے خارج کی پرچھائیں اس کے
تعاقب میں ہے
وہ جو خارج میں حیران تھا
اپنے باطن میں بھی کتنا ویران ہے
آج بھی وہ کھنڈر کی طرح کتنا سنسان ہے!

(فروری ۱۹۹۷ء)

O

سر تا پا صحرا ہوں اور خاصیّتِ دریا رکھتا ہوں
میں تو فصیلِ شب میں بھی روشن دن کا دریچہ رکھتا ہوں

روتے روتے رات کٹے اور گاتے گاتے دن گزرے
مر مر کر جیتے رہنے کا ایک سلیقہ رکھتا ہوں

میں بھی عجب مٹی سے بنا ہوں، ریت کو ریشم تک کہہ دوں
ناممکن کی سوچ میں بھی امکان کا دَر وا رکھتا ہوں

شکر ہے، دورِ رواں کے سفر میں میری اَنا محفوظ رہی
ٹھوکر پر ٹھوکر کھا کر بھی خود پہ بھروسا رکھتا ہوں

میرے نقادوں کو بتاؤ، میرا بھٹکنا کھیل نہیں
دائیں بائیں گھوم آتا ہوں، سمت کو سیدھا رکھتا ہوں

میری انجمن آرائی پر طعنہ زنی کا جواز غلط
بھیڑ میں تو گم ہو جاتا ہوں ، ذہن کو تنہا رکھتا ہوں

میں نے خلا کو چونکایا ہے ، چاند کو چھو کر دیکھا ہے
اب اس سے بھی کچھ آگے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں

میرا فرشتوں سے کیا ناتا ، میری صفات ہی یکتا ہیں
میں لبِ گویا ، دیدۂ بینا ، سوزِ تمنا رکھتا ہوں

دشتِ بہشت انسانوں کی ہے متروکہ جاگیر ندیمؔ
پھر سے اُس ویرانے میں بسنے کا سودا رکھتا ہوں

(مئی ۱۹۹۷ء)

O

اب صبح کے ماتھے پہ ستارہ نہیں ہوتا
ویسے تو شبِ ہجر میں کیا کیا نہیں ہوتا

ہر وقت کا ہنسنا ہو کہ ہر وقت کا رونا
ہر کام جو بے حد ہو ، وہ اچھا نہیں ہوتا

میں نے اسے مانوس سا محسوس کیا ہے
ہر چہرہ جو پہلے کبھی دیکھا نہیں ہوتا

انساں کی انا بھی تو عبادت ہے خدا کی
اپنا جو نہ ہو ، وہ تو کسی کا نہیں ہوتا

منزل پہ پہنچنے کی مسرت ہے حق اس کا
جس شخص نے رستہ کبھی پوچھا نہیں ہوتا

مصروفِ سفر رہتے ہیں سناٹے مرے ساتھ
میں وسعتِ صحرا میں بھی تنہا نہیں ہوتا

(جون ۱۹۹۷ء)

ایک سفر

قہر کا حبس تھا ، گرمی سے جھلستا تھا بدن
دھوپ ایسی تھی کہ دوزخ کا گماں ہوتا تھا
ریت ٹیلوں پہ سلگتی سی نظر آتی تھی

پھر یکایک میری آنکھوں میں طراوت آئی
دُور اِک پیڑ نظر آیا جو ویرانے میں
اس کی چھاؤں کے تصور نے مجھے تھپکایا

میں تھکا ماندہ مسافر جو وہاں سستایا
اِک عجب درد بھری نیند اُمڈ کر آئی
میں نے رگ رگ میں نشہ کوئی اُترتا پایا

میں مسافر تھا، مرا وقت بہت قیمتی تھا
اور تادیر مَیں خوابیدہ نہ رہ سکتا تھا
اُٹھنا چاہا تو مرے جسم سے اُٹھا نہ گیا

چونک کر میں نے جو دیکھا تو سبھی پتوں پر
ڈنک تانے ہوئے بیٹھے تھے ہزاروں بچھو
ٹہنیاں لپٹے ہوئے سانپوں کے گہوارے تھیں

نیند کا نشہ جو اُترا تو میں کچھ اور ہی تھا
اِس قدر زہر مرے جسم کے اندر اُترا
کہ مجھے زہر کا تریاق بنا ڈالا ہے

(اگست ۱۹۹۷ء)

تخلیقِ شعر

نصف شب کا عالم ہے
ہر طرف خموشی کا
بے حدود پہرا ہے
جیسے وقت ، پل بھر کو
سانس لینے ، ٹھہرا ہے
اِک مہین سرگوشی
جی لگا کے سنتا ہوں
ایک شعر کہنے کو
ایک خواب بُنتا ہوں

نرم رو ہوا کا ہاتھ
ننھے ننھے پیڑوں کا
پالنا ہلاتا ہے
اک بلیغ سناٹا
اک لطیف لہجے میں
لوریاں سناتا ہے
بدلیوں کے روزن میں
چاند مسکراتا ہے
اک خیال آتا ہے
کائنات پر طاری
ایک عالمِ ہُو ہے
اک طلسم ہر سُو ہے
اور اس کی وسعت میں
سوندھی سوندھی خوشبو ہے
ذہن کے دھندلکے میں
اک چراغ جلتا ہے
ایک پھول کِھلتا ہے
ایک شعر ڈھلتا ہے

(مارچ ۱۹۹۸ء)

O

ہم دشت کی خاک چھانتے ہیں
اور اپنے خدا کو مانتے ہیں

ہم نے جنہیں تیر زن بنایا
وہ تیر ہمیں پہ تانتے ہیں

سیلاب کی زد میں رہنے والے
پانی کا مزاج جانتے ہیں

جب عرش کو چھو لیا، تو سوچا
اب اور کہیں کی ٹھانتے ہیں

(اپریل ۱۹۹۸ء)

O

تودۂ سنگ میں اصنام مچلتے دیکھے
میں نے وحدت کے کئی روپ بدلتے دیکھے

درد کی دھوپ نے شب کو بھی مرا ساتھ دیا
عمر بھر میں نے تو سائے نہیں ڈھلتے دیکھے

حکمرانی کا جو فردا ہے، مرے سامنے ہے
میں نے ہر قصر میں آسیب سے چلتے دیکھے

مجھ کو انصاف کے معیار کی سوگند ندیمؔ
اہلِ شر چار طرف پھولتے پھلتے دیکھے

(اپریل ۱۹۹۸ء)

O

نہ جانے یہ صدا آئی کہاں سے
کہ گونج آنے لگی ہے آسماں سے

فرشتوں کی سنو سرگوشیاں بھی
خلاؤں کو ہٹا کر درمیاں سے

چمن کا گوشہ گوشہ سُن رہا ہے
گلوں کا راز ، نکہت کی زباں سے

نظر آنے لگے منزل کے آثار
بچھڑ کر جب بھی دیکھا کارواں سے

(مئی ۱۹۹۸ء)

O

بے نیازی ہے کہ سودا کوئی
نہ توقع نہ تمنا کوئی

میتیں چار طرف بکھری ہیں
اور ناپید مسیحا کوئی

اوس پھولوں پہ کچھ ایسے اُتری
جیسے جی کھول کے رویا کوئی

دشت یہ سوچ کے ناپے مَیں نے
راستہ کاٹے گا دریا کوئی

یہ بھی کیا عدل ہے اے عدل پناہ
کوئی اونچا ہے تو نیچا کوئی

میں نے انسان بہت پرکھے ہیں
کوئی گلشن ہے تو صحرا کوئی

۷ میرے احباب کے دو طبقے ہیں
کوئی اچھا ، بہت اچھا کوئی

۸ جس کے محتاج ہیں راتوں کی ندیم
کاش یہ راز سمجھتا کوئی

(۲۹ جولائی ۱۹۹۸ء)

O

پسِ دل ہے چمن آرا کوئی
ہو اگر دیکھنے والا کوئی

یہ تصور بھی عجب نعمت ہے
درمیاں میں نہیں پردا کوئی

ایک دُنیا کی ہیں نظریں اُس پر
اور بیٹھا ہے اکیلا کوئی

سائے کی ہمسفری کافی ہے
گر ہو درکار سہارا کوئی

اس کو دیکھا تو خدا یاد آیا
نظر آیا نہ پھر ایسا کوئی

(۳۰ر جولائی ۱۹۹۸ء)

O

تلاشِ حق میں ہم کیوں مبتلا ہیں
حقائق سب خلا اندر خلا ہیں

عبادت بھی اب اک کارِ جنوں ہے
کہ ہر انسان کے اپنے خدا ہیں

سفر تاریخ کا ہے دائروں میں
نقوشِ پا تو ورنہ جابجا ہیں

یہی کچھ سوچتے اِک عمر گزری
کہ ہم اک دوسرے سے کیوں جدا ہیں

یہ بدنامی نہیں تو اور کیا ہے
کہ ہم منجملۂ اہلِ وفا ہیں

(اگست ۱۹۹۸ء)

عورت

وجود میرا کہیں ہے بھی ، یا کہیں بھی نہیں

اُدھر میں دعوتِ شرب و طعام کے ہمراہ
وہ ناگزیر ضرورت رہی ہوں ، جس کے بغیر
ہر ایک عیش کی تقریب نامکمل ہے

اِدھر میں چلتی ہوئی اِک مشین کا پرزہ
جو گھس گیا ہو تو کوڑے کے ڈھیر کا حصہ

اُدھر میں ملکۂ عالم کہ جس کے حسن کا سحر
شہنشہوں کو کھلونا بنائے رکھتا ہے

اِدھر میں صبح سے تا صبح ایک خادمہ ہوں
کہ جس کا ہاتھ ذرا سا رُکے، تو بارشِ سنگ
کچھ ایسے برسے کہ سب کچھ اُدھیڑ کر رکھ دے

میں اس تضاد کی چکی میں پس رہی ہوں سدا
مرا وجود قیامت بھی اور مصیبت بھی!

(جنوری ۱۹۹۹ء)

O

کیوں میری سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا
اب رونا جو چاہوں مجھے رونا نہیں آتا

جاتا بھی ہے آتا بھی ہے خورشید ازل سے
انسان جو جاتا ہے، دوبارا نہیں آتا

ہر دُکھ کے جلو میں چلے آتے ہیں نئے دُکھ
دُکھ بھی ہے عجب دوست کہ تنہا نہیں آتا

اک عمر سے اُس فکر کی کشتی میں رواں ہوں
جس میں سے نظر کوئی کنارا نہیں آتا

جامد نہیں گر وقت ، تو حیراں ہوں کہ اس میں
امروز ہی امروز ہے ، فردا نہیں آتا

اے حسن ، مجھے لمس کا اعزاز عطا کر
مجھ کو تو ہیولوں سے لپٹنا نہیں آتا

(جنوری ۱۹۹۹ء)

غزل

O

جو عیب جو تھے ، وہ میرا ہنر نہ دیکھ سکے
جدھر بہشتِ نظر تھی ، اُدھر نہ دیکھ سکے

عجیب لفظ پرستوں سے واسطہ تھا مرا
کہ فن میں وہ مرا خونِ جگر نہ دیکھ سکے

شمار کرتے رہے میرے جسم کے گھاؤ
انا کے زخم مرے چارہ گر نہ دیکھ سکے

تمام زندگی جن کی ہنسی کا ساتھ دیا
وہ بھول کر بھی مری چشمِ تر نہ دیکھ سکے

نہ یہ نصیب ، نہ انصاف کا تقاضا ہے
کہ ساری رات کا جاگا ، سحر نہ دیکھ سکے

یہ کس نے لوحِ مقدر پہ لکھ دیا ہے ندیمؔ
کہ جو درخت اُگائے ، ثمر نہ دیکھ سکے

(فروری ۱۹۹۹ء)

O

طُور سے کوئی علاقہ ہے، نہ ربط ایمن سے
روشنی میں نے سمیٹی ہے کسی چِتوَن سے

بجلیوں کو تو برسنا تھا سو برسیں شب بھر
ورنہ خرمن تھے بہت دُور مرے مسکن سے

میرا سرمایہ ہیں جذبات و خیالات مرے
سر جو کٹتا ہے، کٹے، دل نہ جُدا ہو تن سے

مجھ کو ان رابطوں پر ٹوٹ کے پیار آتا ہے
گردِ رہ لپٹی چلی آئی مرے دامن سے

گُنج زنداں میں یہ کہتے ہوئے دن گزرا ہے
شائد آجائے کوئی ایک کرن روزن سے

شعلۂ حُسن دبانے سے نہیں دب سکتا
کہ شعاعیں تو چھلک پڑتی رہیں چلمن سے

ایسا دیوانہ کیا ہے مجھے تنہائی نے
کہ رفاقت کی توقع ہے مجھے دشمن سے

لُٹ رہا ہوں، مگر اتنی تو تسلی ہے ندیمؔ
شہر کا راستہ پوچھوں گا اسی رہزن سے

(جون ۱۹۹۹ء)

رابطہ

سحر کے وقت
جب چڑیاں درختوں اور مکانوں کی منڈیروں پر اُترتی ہیں
مجھے محسوس ہوتا ہے
ابھی قدرت کا اور انسان کا ناتا نہیں ٹوٹا
وگرنہ یہ بہت پیارے پرندے
یہ ہواؤں کے، فضاؤں کے نمائندے
مسلسل چہچہاتے
دائروں میں رقص کرتے
ابتداء سے آج تک

نورِ سحر کے ساتھ ہی
حیران کُن حسنِ تواتر ہے
بھلا کس کی ہدایت پر
قطار اندر قطار آتے ہیں
اور صبحوں کو
اپنے دلربا، معصوم نغموں سے سجاتے ہیں!

(جولائی ۱۹۹۹ء)

O

یہ کس کا حسن جھلکتا ہے میرے شعروں میں
نقاب کس نے اُلٹ دی مرے خیالوں میں

کہیں یہی تو نہیں پیار کا لطیف اظہار
بہت خفیف سی لرزش ہے اس کے ہونٹوں میں

ہوائے ہجر بہت زور سے چلی، لیکن
چراغ جلتے رہے یاد کے دریچوں میں

جو وہ نہیں ہے تو اِن کا جواز کچھ بھی نہیں
مہ و نجوم کھٹکتے ہیں میری آنکھوں میں

کئی کروڑ کُرے گھومتے دکھائی دیئے
عجب طلسم تھا صحراؤں کے بگولوں میں

ندیمؔ ذہن سے کانٹوں کا خوف جاتا رہا
کہ مجھ کو پھول نظر آ گئے ببولوں میں

(نومبر ۱۹۹۹ء)

دائرے کی اسیری

مجھ مسافر کو بتایا بھی تو ہوتا مرے رہبر، مرے دوست!
کہ مجھے دائرے میں گھومتے رہنا ہے ہمیشہ کے لیے

تجھ کو معلوم تو ہوگا شاید
دائروں میں فقط اجرامِ فلک گھومتے ہیں
میں تو اولاد ہوں آدم کی، جسے صبحِ ازل
حق نے مسجودِ فرشتوں کا بناتے ہوئے فرمایا تھا
یہ خلیفہ ہے زمیں پر میرا

میں نمائندۂ حق ہوں، مجھ کو
دائرے میں کوئی محبوس نہیں کر سکتا
تو نے آغاز سے کیوں مجھ پہ مسلّط رکھا
ایک ہی دائرے میں گھومتے رہنے کا عذاب
مجھ کو آفاق در آفاق سفر کرنا ہے
مجھ کو تو ڈھونڈنا ہے، کھوجنا ہے
اُس حقیقت کو جو محبوس نہیں دائرے میں
شش جہت کے کسی گوشے میں جو پوشیدہ ہے

دائرہ ٹوٹ بھی سکتا ہے
سو میں آج اسے توڑتا ہوں
مجھ کو ذروں سے ستاروں تک کا
اور فضاؤں سے خلاؤں تک کا وہ سفر کرنا ہے
جو تقاضا مری تخلیق کا ہے

(۹ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

O

جیسے ہی تُو جُدا ہُوا ، وقت کا وار چل گیا
تارے کہیں بھٹک گئے ، چاند کہیں نکل گیا

تیرا ذرا سا اِلتفات ، مرکز و محورِ حیات
سنگِ گرانِ دردِ دل ، موم ہوا ، پگھل گیا

تیری نگاہ جب اُٹھی ، روح میں نُور بھر گئی
ایک ہی پل میں دُور تک ، منظرِ جاں بدل گیا

عشق کاراز کیا کھلا ، جیسے شرر بکھر گئے
ایک ذرا سی بات سے ، شہر کا شہر جل گیا

راہ میں آفتاب کی ، پھول بِچھا گئی شفق
صبح کے رُخ پہ دستِ وقت جیسے گُلال مَل گیا

درد شدید تھا مگر اس میں چمک سی تھی ندیم
ایک چراغ اگر بجھا ، ایک چراغ جل گیا

(دسمبر ۱۹۹۹ء)

ملبہ

میں جب بھی سیر کو نکلوں
تو مجھ کو دُھول رستہ ہی نہیں دیتی

ارادہ ہو مرا جب گنگنانے کا
تو خالی پیٹ بچے میرے باطن میں مچل کر چیختے ہیں

جب ثقافت کے مسائل پر مَیں کچھ بولوں
تو خنجر میرے سینے میں اُترنے کے لیے تیار رہتے ہیں

میں سچ بولوں
تو جُھوٹے، شعلہ بار آنکھیں دکھاتے ہیں

اگر میں جُھوٹ کی کوشش کروں
تو مجھ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی آرے سے
مجھے اندر سے اندر کاٹتا ہے

اب یہی سوچوں
کہ کوہِ فکر کی پگڈنڈیوں سے دھند کے پتھر ہٹانا کتنا مشکل ہے

مرے ذہنِ رسا!
گزری صدی کی آزمائش سے نکل کر ہی تو میں اگلی صدی کے
صدر دروازے سے گزروں گا

مجھے گزری صدی لیکن گزرنے ہی نہیں دیتی
کہ اس کا ڈھیروں ملبہ چار جانب سے مجھے گھیرے ہوئے ہے

(جنوری ۲۰۰۰ء)

O

میں اپنی شاخ سے ٹوٹا نہیں ہوں
خزاں کا زرد رُو پتّا نہیں ہوں

ابھی قُربِ خدا کی سرخوشی ہے
ابھی مَیں ہوش میں آیا نہیں ہوں

خدا کا ساتھ کب چھُوٹا ہے مجھ سے
ابھی جنت سے میں نکلا نہیں ہوں

تصور کے ہیولے میرے ساتھی
میں تنہائی میں بھی تنہا نہیں ہوں

مرے اندر الاؤ جل رہے ہیں
میں وہ آنسو ہوں، جو ٹپکا نہیں ہوں

(فروری ۲۰۰۰ء)

ساون رُت میں

رُت ہے ساون کی
اور صبح سے تیز بارش
مرے گھر کی چھت پر بجے جا رہی ہے
مگر کچی مٹی کی چھت
جب یہاں سے وہاں تک ٹپکنے لگی ہے
تو ٹپکا مرے گھر کے مٹی لپے فرش کو
چھلنی چھلنی کیے دے رہا ہے

ایک ٹپکے کے نیچے کٹورا جو رکھا
تو جیسے کوئی ساز بجنے لگا
ایک ٹپکے نے ایک اور برتن میں طبلہ بجایا
سِتار ایک برتن میں کچھ گنگنانے لگا
گھر کے ایک ایک برتن کو
ٹپکوں کے نیچے رکھے
اپنے کوٹھے کے گوشے میں دُبکا ہوا
ساز و آواز کا ایک جادو جگائے
مزے لے رہا ہوں!

(اگست ۲۰۰۰ء)

O

غول در غول چلے آتے ہیں دیوانوں کے
آج دروازے کھلے رہنے دو زندانوں کے

اب عناصر بھی تباہی کی نہ تکلیف کریں
اب تو انسان ہی دشمن ہوئے انسانوں کے

رات بھر شمع نے محفل کو اُجالا ، لیکن
صبح کو ڈھیر سمیٹے گئے پروانوں کے

اے خدا! میں ترے دربار میں کیسے پہنچوں
کتنے خونخوار ہیں تیور ترے دربانوں کے

اب جنوں کا بھی اک انداز نرالا ہے ندیمؔ
لوگ سی لیتے ہیں خود ، چاک گریبانوں کے

(ستمبر ۲۰۰۰ء)

O

جو بات بات پہ دل کو لہو لہو کرتے
تو اس طرح بھی ہمیں یار سرخرو کرتے

اکیلے بیٹھ کے ، چپ چاپ دن کو نمٹایا
گزاری رات ستاروں سے گفتگو کرتے

فراقِ یار تھا یا مستقل قیامت تھی
کٹی ہے عمر اسی چاک کو رفو کرتے

جو زندگی ہمیں اِک بار اور مل جاتی
خدا گواہ ، تمہاری ہی آرزو کرتے

تمہارے ملنے پہ بھی کب تلاش رُک پاتی
کہ اس کے بعد ہم اپنی بھی جستجو کرتے

اگر وہ آئنہ ملتا جو صرف سچ بولے
تو ہم ندیمؔ کو خود اس کے روبرو کرتے

(اکتوبر ۲۰۰۰ء)

O

زمانہ خدا کی عدالت لگا
سو جو قہر تھا ، مجھ کو رحمت لگا

خدا نے عطا کی مجھے زندگی
سو ایک ایک لمحہ امانت لگا

جب اس نے محبت سے دیکھا مجھے
میں خود کو بہت خوبصورت لگا

محبت سے انکار کرتے ہوئے
مجھے وہ سراسر محبت لگا

مرے ساتھ چلتا عدو بھی ، مجھے
چراغِ سرِ راہِ غربت لگا

بہت کربِ برداشت کا کام ہے
مجھے ہجر رب کی عبادت لگا

ندیمؔ اتنی شدت رہی حبس کی
کہ ایک ایک لمحہ قیامت لگا

(نومبر ۲۰۰۰ء)

O

ہر پھول پہ دھول جم رہی ہے
کہنے کو یہ بیسویں صدی ہے

بازار میں دو جہاں کی دولت
ناموس کے مول بک رہی ہے

بہلاتے ہیں چارہ گر یہ کہہ کر
اس غار کے پار روشنی ہے

انسان تو خیر ہے ہی فانی
جو مر نہ سکا ، وہ آدمی ہے

کب چھوڑا ہے گل کو رنگِ گل نے
خوشبو تو چمن چمن اڑی ہے

چڑیا اُتری ہے شاخِ گل پر
پیاسی ہے ، سو اوس پی رہی ہے

اے ڈوبنے والے زرد رُو چاند!
اب میری تجھی سے دوستی ہے

میں جرمِ وفا کا مرتکب ہوں
ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمی ہے

(دسمبر ۲۰۰۰ء)

مجھے مایوس ہونا ہی نہیں آتا

مجھے مایوس ہونا ہی نہیں آتا
نہ جانے کیسی جیتی جاگتی مٹی
مری تعمیر میں شامل ہے
جس نے، ہر حالت میں
مجھ کو زندگی کرنے پہ اُکسایا

ادھر جب دُکھ چٹانوں کی طرح مجھ پر برستے ہیں
تو مجھ کو
ایک پتھر کے تلے
جب پھوٹتی ننھی سی اک کونپل دکھائی دے رہی ہو
تو یہ سب کی سب چٹانیں
ریزہ ریزہ ہوتی جاتی ہیں
اِدھر بدخواہ مل کر مجھ پہ جب یلغار کرتے ہیں

تو اک چھوٹی سی بچی کی شگفتہ مسکراہٹ
اک صلابت بن کے
میرے باطن میں اُتر جاتی ہے
اور مجھ پر جو حملہ کرنے آتے ہیں
کچھ اس انداز سے تحلیل ہو جاتے ہیں
جیسے اُن کا ہونا بھی، نہ ہونے کے برابر ہے

ادھر جب آسماں سے بجلیاں برسائی جاتی ہیں
تو میں اپنے کُھلے کھلیان کو
اپنے بدن سے ڈھانپ لیتا ہوں
کڑکتی بجلیاں جب ہانپ جاتی ہیں
تو بجھ جاتی ہیں
تب میرا کُھلا کھلیان
اپنے تخلیقی نوادر
عالمِ انسانیت میں بانٹ دیتا ہے

مجھے مایوس ہونا ہی نہیں آتا
مجھے محسوس ہوتا ہے

عناصر کی لگامیں میری مُٹھی میں ہیں
میری ڈھال میرے پھول ہیں
میرے پرندے میرے پہریدار ہیں
اور میری صُبحیں میرا آنگن ہیں
وہاں سے نیلی نیلی روشنی کے پار
خلاّقِ دوعالم کے نقوشِ حُسن
میرے جسم میں وہ نور بھر دیتے ہیں
جو مجھ کو کبھی مایوس ہونے ہی نہیں دیتا

(جنوری ۲۰۰۱ء)

ہم

اِک عمر سے فریبِ سفر کھا رہے ہیں ہم
معلوم ہی نہیں کہ کہاں جا رہے ہیں ہم

یوں گرد سے اَٹے ہیں کہ پہچان مٹ گئی
لیکن یہ وہم ہے کہ چلا پا رہے ہیں ہم

بنیادِ پختہ کا تو نہ آیا کبھی خیال
چھت جھکتی آ رہی ہے تو پچھتا رہے ہیں ہم

برسوں سے انتظار ہے اِک نخلِ سبز کا
آبِ حیات ریت پہ ٹپکا رہے ہیں ہم

یہ سوچتے ہیں ٹوٹتے تاروں کو دیکھ کر
منزل سے، رفتہ رفتہ قریب آرہے ہیں ہم

اِک دائرے میں گھومتے پھرتے رہے ندیم
اس وہم میں مگن کہ بڑھے جا رہے ہیں ہم

(جنوری ۲۰۰۱ء)

افغانستان

بچے جب موت کے گھیراؤ میں چیخے
تو یہ سب نے دیکھا
ہفت افلاک تڑختے ہی چلے جاتے ہیں

ماؤں کی کوکھ جب اُجڑی
تو فرشتوں کی قطاروں پہ قیامت ٹوٹی
بہنوں نے بھائیوں کے خون میں ڈوبے ہوئے آثار سمیٹے
تو بہت زور سے لرزا ہے نظامِ شمسی

مٹی کے کچے گھروندوں پہ سلگتا ہوا فولاد گرا ہے
تو دراڑیں نظر آنے لگیں ایوانوں میں

ذہنِ انسان کی آغوش نے یہ ملبہ سمیٹا ہے
تو ہر لفظ میں اِک لاش چلی آئی ہے

تم جو زندہ نظر آتے ہو
مگر مردہ ہو
تم نے انسانوں کو "اشرف" کی بلندی سے نشیبوں میں کچھ
اس طرح سے دے مارا ہے
جیسے کوئی کُوڑا پھینکے
اور تاریخ وہ سفّاک حقیقت ہے
رعایت نہیں کرتی
کہ وہ سچ بولتی ہے

(۲۸ر جنوری ۲۰۰۱ء)

ایشیائی

میں جو ایشیائی ہوں

کتنی صدیوں سے سوچتا ہوں

کہ ایشیا — مرا ایشیا تو پیمبروں کی ہے سرزمیں

مگر اس پہ حق کسی ایشیائی کا ماننا ہی اصولِ یورپ و امریکہ

کے خلاف ہے

مرے ایشیا کے پیمبروں کے سوا اُنہیں

کوئی زندگی کا شعور ہی نہ دلا سکا

کوئی ان کو مسندِ علم پر نہ بٹھا سکا

مگر اس کے بعد وہی تھے

جو مرے ایشیا کا لہو نچوڑ کے پی گئے

اِسی سرزمیں پہ

پیمبروں کی جو سرزمیں ہے

وہ کتنی صدیوں سے رقصِ مرگ میں مبتلا ہیں

کچھ اس ادا سے

کہ جیسے میرے وہی خدا ہیں

میں اُن سے آخری بار ــــ آخری بار کہتا ہوں ــــ

دوستو!

جو مرا خدا ہے

تمہارا بھی تو وہی خدا ہے

وہی خدا

رہِ راست تم کو دکھائے گا

تمہیں اپنے اپنے گھروں کی رہ پہ لگائے گا

وہ عدالتوں میں کریم

اور محبتوں میں ندیم

اور سیاستوں میں عظیم بننا سجھائے گا

مرے ایشیا کو

جکارتہ سے عراق تک

فقط ایشیائی کا شاہکارِ شعورِ ذات بنائے گا

اسے اپنی عظمت و تمکنت کے جمال سے وہ سجائے گا

مرے ایشیا کو خود آ گہی کی مثال بننا —— کمال بننا سکھائے گا

(فروری ۲۰۰۱ء)

O

سپردگی کا بھی معیار ہونا چاہیے تھا
تری انا کو خبردار ہونا چاہیے تھا

مزاجِ تُند کی تلوار کُند کرنے کو
تجھے کسی کا پرستار ہونا چاہیے تھا

وفورِ عشق نے اُس کو بھی موم کر ڈالا
جسے مزاج میں کہسار ہونا چاہیے تھا

وہ جس کے سر میں شعورِ جمال بھی ہوتا
اُسی کو صاحبِ دستار ہونا چاہیے تھا

بہار میں بھی ببولوں سے ڈھک گئی ہے زمیں
اِسی نواح میں گلزار ہونا چاہیے تھا

فصیلِ شہر سے بھی دھوپ چھَن کے آنے لگے
یہاں تو سایۂ دیوار ہونا چاہیے تھا

میں دشمنوں سے بصد عجز عرض کرتا ہوں
تمہارا کوئی تو کردار ہونا چاہیے تھا

ملا ہے حکم جسے بجلیاں گرانے کا
اُسی گھٹا کو گہربار ہونا چاہیے تھا

ندیم سارے زمانے کے دُکھ سمیٹ، مگر
کچھ اپنے غم کا بھی اظہار ہونا چاہیے تھا

(مارچ ۲۰۰۱ء)

وقت

شام ہوتی ہے کہیں
اور کہیں صبح کی پو پھوٹتی ہے
صبحیں اِس تودۂ خاکی پہ
تسلسل سے سفر کرتی ہیں
شب کو لاہور سے جب میں نے شکاگو میں کیا فون
تو معلوم ہوا
دوپہر ہونے کو آئی ہے وہاں

وقت کے اپنے طلسمات ہیں
وہ فقط رنگ بدلتا ہے
گزرنا اُسے آتا ہی نہیں

(اپریل ۲۰۰۱ء)

عدم

میں نے اِک روز عدم میں جھانکا
میں نے دیکھا کہ وہاں
ریت کے ذرات کی گنتی پہ ہیں مامور وہ لوگ
زندگی میں بھی جو ذرات ہی گنتے رہے
مر جانے تک

(اپریل ۲۰۰۱ء)

سرگوشی

میں کل چمن سے گذر رہا تھا
تو مجھ کو سرگوشیوں کی آواز آ رہی تھی
مگر یہ سرگوشیاں کہاں تھیں
گلاب کی جھاڑیوں میں
کلیاں چٹک رہی تھیں

(اپریل ۲۰۰۱ء)

O

خوشی ہی نہیں ہے، اَلَم اَلَم ہی نہیں
یہ کون لوگ ہیں جینے کا جن میں دم ہی نہیں

یہ درد و کرب ہے پہچان آدمیت کی
وہ آدمی ہی نہیں جس کو کوئی غم ہی نہیں

چُرا کے لے گئے اغیار دشت کے معیار
کہ عصرِ نو کے غزالوں میں خوئے رَم ہی نہیں

کسی کو بھی مرے باطن پہ دسترس کیوں ہو
میں رو رہا ہوں مگر میری آنکھ نم ہی نہیں

(مئی ۲۰۰۱ء)

○

یہ خواب دیکھتا ہوں ، انتظار کرتے ہوئے
تو آ رہا ہے ستاروں پہ پاؤں دھرتے ہوئے

ہر ایک فرد کا چہرہ ہے ہو بہو تیرا
میں لٹ گیا ہوں ترے شہر سے گزرتے ہوئے

تری نگاہِ کرم ہی نے بھر دیا دامن
جھجک رہا تھا میں تجھ سے سوال کرتے ہوئے

یہ دیکھ کر مجھے خود پر بڑا ترس آیا
تو رو رہا تھا مرے ذہن سے اترتے ہوئے

حیات ایک سمندر ہے ، وہ بھی طوفانی
تمام عمر کٹی ڈوبتے اُبھرتے ہوئے

نہیں ہے کیوں کوئی حد تیری کائناتوں کی؟
خدا سے پوچھتا رہتا ہوں، ڈرتے ڈرتے ہوئے

(جولائی ۲۰۰۱ء)

آہٹ

یارب! یہ کیسی آہٹ ہے؟
چار طرف سے
افق افق سے
اُمڈ اُمڈ کر آتی آہٹ
اس آہٹ سے پُورب، پچھّم، اُتّر، دکِھن گونج رہے ہیں
یہ آہٹ فرمانِ الٰہی کے سے تیور رکھتی ہے
لیکن آخر
روزِ ازل سے اب تک کے معمول سے ہٹ کر
کون ہے جو آفاق سے تا آفاق کچھ ایسے چلتا ہے
جیسے کچھ ہونے والا ہے!
یارب! کیا ہونے والا ہے؟

(۲۹ر ستمبر ۲۰۰۱ء)

بہار وخزاں

(۱)

ہوائے خزاں
ایک شاخِ شجر پر جو جھپٹی
تو سوکھے ہوئے زرد پتّے
ہزاروں کی تعداد میں
ٹوٹتے ٹوٹتے ہنس دیئے
اور اک دوسرے کو بتایا:
خزاں کو خبر ہی نہیں ہے
کہ دو چار لمحات کے فاصلے پر
بہار آ رہی ہے

(۲)

خزاں سونے کی رنگت پر
بہت مغرور ہوتی ہے

مگر سونا کسی کا ساتھ کب دیتا ہے
وہ چھن جائے
یا پگھلا دیا جائے

(۳)

شمیمِ گل نے
دیوارِ چمن پھاندی
تو اپنی راہ پر جاتا ہوا شاعر رُکا
دیوار پر سے جھانک کر دیکھا
کہ رنگِ گل تو گل میں گُھل گیا ہے

(۴)

بہار اک پھول کی پتّی پہ
شبنم بن کے بیٹھی تھی
کہ اک جھونکے نے اس کو گدگدایا
اور زمیں نے اس کو سینے سے لگایا

(اپریل ۲۰۰۲ء)

شہر اور شر

شہر اور شر میں بظاہر فقط اِک حرف کا ہی فرق سہی
شہر اور شر میں بڑا فرق ہے، پیارے لوگو
شہر اگر شہر کی مخلوق کے بھرپور تحفظ کی ضمانت ہے
تو شر
اُس کی تقدیس کی تنسیخ ہے، پیارے لوگو
شہر کو امن کدہ کہتے ہیں تاریخ نگار
اور شر ہے فقط اِک فتنہ، فقط ایک فساد
دست و لب شر کے ہیں آلودۂ خونِ انساں

ساری دُنیا کو بتا دو کہ بظاہر فقط اِک حرف کا فرق
بحر کو بر میں بدل سکتا ہے
شہر کو شر میں بدل سکتا ہے
شر کو شہروں سے نکالو گے تو شاید، میرے پیارے لوگو
سر پہ منڈلاتا ہوا روزِ قیامت ٹل جائے

(جولائی ۲۰۰۲ء)

ابھی بند مٹھی نہ کھولنا

(عالمی جوہری جنگ کے خوفناک امکانات کے حوالے سے)

ابھی بند مٹھی نہ کھولنا!
کبھی بند مٹھی نہ کھولنا!

ترے ہاتھ میں، تری موت کا وہی فیصلہ ہے رکھا ہوا
جو لکھا ہے تُو نے خود اپنی دانشِ بے جہت کے قلم سے
جب یہ عذاب ٹوٹ پڑا تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا
زمین کو ترا علم ایک بڑی سی قبر بنائے گا
کوئی دھجیوں کا غلاف بھی نہ چڑھائے گا
ابھی بند مٹھی نہ کھولنا!
کبھی بند مٹھی نہ کھولنا!

یہ جو تیرے چار طرف پہاڑ پگھل رہے ہیں
تپش کچھ اِتنی شدید ہے

کہ سمندروں سے اُبال اُمڈ کے زمیں کو ڈھانپتا جا رہا ہے
آسمان بس ایک نیلا سا چیتھڑا ہے
جو پھڑ پھڑائے گا
اور فرش سے عرش تک کی یہ کائنات
غبارِ مرگ میں ڈوب جائے گی

یہ فقط اسی خوف کا ہے کیا دھرا
کہ کہیں کوئی تری بند مُٹھی نہ کھول دے
ابھی بند مُٹھی نہ کھولنا!
کبھی بند مُٹھی نہ کھولنا!

(ستمبر ۲۰۰۲ء)

O

سِل گئے چاک گریبانوں کے
مشغلے چِھن گئے دیوانوں کے

جبر کی آندھیاں شدت سے چلیں
پلڑے لرزاں رہے میزانوں کے

روندتے پھرتے ہیں پھولوں کی بساط
خود نگہبان گلستانوں کے

نور کی جگہ دُھواں چھوڑتے ہیں
بجھتے فانوس شبستانوں کے

جتنا سستا ہُوا انساں کا وقار
نرخ بڑھتے رہے ایمانوں کے

لوگ آئیں گے پنہ لینے کو
در مقفل رکھو زندانوں کے

اب فصیلوں پر رعایا ہے سوار
اب کڑے وقت ہیں سلطانوں کے

اُترے جاتے ہیں نشیبوں میں ندیمؔ
اونچے معیار سخن دانوں کے

(نومبر۲۰۰۲ء)

O

عجب انداز کی یہ انجمن آرائی ہے
میں ہوں ، سناٹا ہے ، تاریکی ہے ، تنہائی ہے

کان دھر کر کبھی اصنام کی باتیں بھی سنو
میں اگر چپ ہوں ، تو یہ بھی مری گویائی ہے

ہیں اُفق پر جو بغلگیر خدا اور انساں
آسماں اور زمیں کی وہیں یکجائی ہے

میں ہر انسان کی فطرت میں وفا ڈھونڈتا ہوں
لوگ کہتے ہیں یہ شاعر نہیں ، سودائی ہے

کتنا آسودہ تھا میں گوشۂ درویشی میں
در حقیقت مری شہرت ، مری رسوائی ہے

یہ جو اِک عمر سے کچھ کھوجتا پھرتا ہے ندیمؔ
صرف بے لوث محبت کا تمنائی ہے

(جنوری ۲۰۰۳ء)

طاقت

طاقت اک آسیب ہے
جو خود طاقتور کو کھا جاتا ہے

لیکن اِس سے پہلے
طاقت کتنے بہت سے جسموں پر سے
اُن کے سروں کو تراش کے لے جاتی ہے
اور پھر بُھون کر کھا جاتی ہے

لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں عورت
اپنے عورت ہونے کی پاداش میں
بیچی اور خریدی جانے لگتی ہے
اور کچلی، روندی اور چبائی جانے لگتی ہے

اربوں کھربوں انسانوں سے
بوٹی بوٹی، ہڈی ہڈی کا جرمانہ لے کر
ان کے ڈھانچے
محرومی کے کوڑے دان میں ٹھونس کے
دوسرے انسانوں کی تلاش میں جُت جاتی ہے
لیکن آخرکار یہ طاقت کا آسیب پلٹ کر طاقتور کو کھا جاتا ہے
انسانی تاریخ کا، خون میں ڈوبا باب، مکمل ہو جاتا ہے

(فروری ۲۰۰۳ء)

O

لب پہ جب اُس کے پلٹنے کی دُعا آتی ہے
اِک دِیا دل کے دریچے میں جلا آتی ہے

جب اُترتی ہیں مرے دل میں پرانی یادیں
کتنی بچھڑی ہوئی کونجوں کی صدا آتی ہے

سوچتا ہوں کہ کہیں قیس نہ ہو گریہ کناں
بھیگی بھیگی سی جو صحرا سے ہوا آتی ہے

میرے باطن میں کوئی قافلہ ہے محوِ سفر
سانس لیتا ہوں تو آوازِ دِرا آتی ہے

اِس حوالے سے ، کہ شہپارۂ تخلیق ہے وہ
مجھ کو انسان سے خوشبوئے خدا آتی ہے

نوعِ انساں کے تقدس کی ہے سوگند ندیمؔ
اپنے دشمن سے بھی اب مجھ کو حیا آتی ہے

(۳ر جون ۲۰۰۳ء، جناح ہسپتال)

O

شیخ کھڑا ہے دم بخود عالمِ بے مثال میں
عمر گزار دی مگر ، محفلِ قیل و قال میں

واعظِ انتہا پسند! آپ کے پندِ سُودمند
بار نہ پا سکے ، مری مملکتِ جمال میں

یوں تو مرے حبیب کا ، سادہ سا اِک وجود تھا
عشق نے نور بھر دیا عام سے خدوخال میں

ہجر کی شاہراہ پر ، جتنے دیے جلے بُجھے
اُتنے ستارے پِس گئے گردشِ ماہ و سال میں

میرے بیانِ ظلم پر لوگ خموش کیوں رہے
عمر گزر گئی اِسی زخم کے اندمال میں

لب جو کھلے ندیمؔ کے ، واعظِ شہر چیخ اٹھا
یعنی بلا کی دھار تھی سہل سے اِک سوال میں

(اگست ۲۰۰۳ء)

ظلمِ عظیم

سُن ظلمِ عظیم کی کہانی
لاشوں کے ہجوم کی زبانی

انساں بھی ستم میں کم نہیں ہے
ہر ظلم نہیں ہے آسمانی

اِس سر کے نقوش کابلی ہیں
وہ دھڑ ہے عراق کی نشانی

کُشتوں کے اُٹھے ہیں جب جنازے
زخموں کی ہوئی ہے گل فشانی

استادِ مہذباں کے ہاتھوں تہذیب نے خودکشی کی ٹھانی

حیرت ہے کہ قتل گاہِ حق کی قاتل کو ملی ہے پاسبانی

اقوام کی انجمن کا دفتر ابلیسِ زماں کی راجدھانی

تاریخ بغور سُن رہی ہے انصاف کے خون کی کہانی

کچھ دن میں زمانہ دیکھ لے گا ڈھلتی جلّاد کی جوانی

کچھ دیر میں منہ کے بل گرے گا
فانی کا غرورِ جاودانی

(ستمبر۲۰۰۳ء)

O

بھلا میری زباں پر شکوہ کب تھا
اگر تھا بھی تو یکسر زیرِ لب تھا

میں سچ کی جستجو میں ہوں ازل سے
یہی طولِ مسافت کا سبب تھا

مرے کیسے میں جو دولت بھری تھی
مرا سرمایۂ شعر و ادب تھا

بدلتے ہی نہیں معیار میرے
وہی غم اب بھی ہے، جیسا کہ تب تھا

یقیناً ظلم ٹوٹا ہے کسی پر
اندھیرا ورنہ اتنا گہرا کب تھا

ندیمؔ ارزاں نہیں تھے میرے سجدے
مرا معبود صرف اِک میرا رب تھا

(جنوری ۲۰۰۴ء)

مژدہ!

(امریکہ کے ایک سابق صدر ٹرومین کے نام)

ایک ہی بم سے
لاکھوں کا اِک شہر بھسم کر دینے،
بچوں، بوڑھوں،
ماؤں، بہنوں،
اور جوانوں کے دھڑ دھڑ جلنے
اور ان کی ہڈیاں ٹوٹنے
ان کی کھال اُدھڑنے
اور ان لاکھوں انسانوں کا ملبہ بن جانے کا مژدہ سُن کر

سات سمندر پار کے
ایک مہذب اور مدبر صاحب ناچ اُٹھے تھے!

وہ مخلوق جو اشرف کہلاتی ہے
اتنی ارذل بھی ہوسکتی ہے!

(مئی ۲۰۰۴ء)

O

رہا ہوں مُبتلا مر مر کے بھی جینے کے چکّر میں
ازل میں زندگی لکھی گئی میرے مُقدر میں

کہاں ہوگا ٹھکانا تیرگی میں ، میرے سائے کا
کہ جب تک دھوپ تھی ، چلتا رہا میرے برابر میں

میں کب تک خاک چھانوں گا ، میں کب تک ریت پھانکوں گا
زمانے بھر کے صحرا آ بسے ہیں کیوں مرے گھر میں

فضائیں بادلوں کے آنچلوں میں خون روتی ہیں
افق پر ڈوبنے لگتا ہے جب سورج سمندر میں

یہی ہوتا ہے ، جب بے سمت ہوں اِدراک کی قدریں
قیامت ، ڈھونڈ لی انسان نے ، ذرّاتِ جوہر میں

کوئی جائے اماں دُنیا میں اس کو مل نہ پائے گی
اگر انسانیت مرنے لگی قلبِ سخنور میں

ندیمؔ اولادِ آدم پر کبھی تو مہرباں ہوگی
وہ قدرت دے رہی ہے جو غذا کیڑے کو پتھر میں

(اگست ۲۰۰۴ء)

مٹی

چاک چلتا ہے تو تخلیق کا در کھلتا ہے
اتنے پیکر نظر آتے ہیں نمو پاتے ہوئے
جیسے مٹی میں وہ سب کچھ ہے، جو میں سوچتا ہوں

(نومبر ۲۰۰۴ء)

O

دگرگوں ہے نظامِ آسمانی
سو اب تخلیق ہو آدم کا ثانی

تضاد ایسا قیامت کا ہے یارب!
کہ تُو باقی ، تری مخلوق فانی

جہنم میں جلے کیوں اس کا شہکار
خدا سے اور اتنی بدگمانی!

مجھے محسوس ہوتا ہے شبِ ہجر
رُکی رہتی ہے لمحوں کی روانی

تمنا دل میں یوں ہے کار فرما
کہ جیسے لفظ میں پنہاں معانی

محبت کی رفاقت گر نہ ملتی
بہت بے مہر ہوتی زندگانی

وفا کو آخری دم تک نبھایا
ندیمؔ اتنی سی ہے اپنی کہانی

(دسمبر ۲۰۰۴ء)

O

بھیک لینے کا حوصلہ نہ ہوا
یوں میں شرمندۂ دُعا نہ ہوا

تیز کرتا رہا جو اپنی خودی
اپنی ہی قید سے رہا نہ ہوا

تیری موجودگی میں ، میرے خدا!
تیری دُنیا میں کیا سے کیا نہ ہوا

جستجو کا نشہ اُتر جاتا
شکر ہے ، تیرا سامنا نہ ہوا

یوں تو کتنے تھے آپ اپنی مثال
تجھ سا کیوں کوئی دوسرا نہ ہوا

بدنصیب اُس سے بڑھ کے کوئی نہیں
جو محبت میں مبتلا نہ ہوا

(دسمبر ۲۰۰۴ء)

O

دستورِ چمن بدل رہا ہے
پھولوں سے لہو نکل رہا ہے

مشرق کو رواں ہے میرا سایہ
سورج مغرب میں ڈھل رہا ہے

دل ہجر کی شب کچھ ایسے دھڑکا
جیسے کوئی شخص چل رہا ہے

یہ معجزہ ہے مری انا کا
آندھی میں چراغ جل رہا ہے

اے ربِ نمو! ترے جہاں میں
کیوں ظلم ہی پُھول پھل رہا ہے

آنکھیں ہیں کہ کب سے بُجھ گئی ہیں
دل ہے کہ مچل مچل رہا ہے

چھوتے ہی نہیں زمیں کو پاؤں
انسان ابھی سنبھل رہا ہے

(یکم جنوری ۲۰۰۵ء)

عناصر

ترے احکام کے تابع عناصر....اے مرے مولا!
بہت منہ زور ہوتے جا رہے ہیں
ترا شہپارۂ تخلیق آدم ہے
جو تیرے حکم سے مسجود ہے تیرے فرشتوں کا
اُسی کی بیٹیوں، بیٹوں کو، بوڑھوں اور بچوں کو
عناصر یوں کچلتے، روندتے، پامال کرتے ہیں
کہ جیسے وہ زمیں پر رینگتے کیڑے مکوڑے ہیں

فرشتوں کو بس اتنا حکم دے....مولا!
کہ وہ روزِ قیامت تک

عناصر کی لگامیں کھینچ کر رکھیں
اُنہیں وہ کچھ نہ کرنے دیں
جو وہ صدیوں سے کرتے آ رہے ہیں
اور کل ہی
ایشیا کے ساحلوں پر
انتہائی بے حسی سے
کر چکے ہیں

(اپریل ۲۰۰۵ء)

O

میں استعمال سچ کا نسخۂ اکسیر کرتا ہوں
میں بے توقیر انسانوں کی بھی توقیر کرتا ہوں

میں سیلابوں سے لڑتا آرہا ہوں کتنی صدیوں سے
میں دریا کے کنارے اپنا گھر تعمیر کرتا ہوں

فقط دیوارِ نفرت پر سجا لیتا ہوں تیروں کو
میں اپنے دشمنوں کی اس طرح تحقیر کرتا ہوں

میں مٹی سے بنا ہوں لیکن اونچی ہے انا میری
میں ساتوں آسمانوں پر زمیں تحریر کرتا ہوں

میں فانی ہی سہی لیکن مرا اسلوب تو دیکھو
میں اپنی زندگی میں روز و شب تسخیر کرتا ہوں

کسی بھی خواب کو میں بے ثمر رہنے نہیں دیتا
کہ میں ہر خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتا ہوں

مرا ایک ایک لمحہ اِک صدی ہے ، اِک زمانہ ہے
میں اپنی شاعری میں وقت کو زنجیر کرتا ہوں

(مئی ۲۰۰۵ء)

O

دل کے صحرا میں ، مہکتا ہے محبت کا گلاب
یہ ہے وہ پھول کہ ڈھلتا ہی نہیں جس کا شباب

چار سو حسن کی دولت سے لبالب چہرے
زندگی خواب سہی — کتنا دلآویز ہے خواب

ہاتھ اُٹھاتا ہوں تو گھر جاتا ہوں سناٹوں میں
یوں بھی ملتا ہے مجھے میری دُعاؤں کا جواب

کب سے ہوں محوِ سفر ، پیاس نہیں بجھ پائی
کتنے بے مہر ہیں بے لوث محبت کے سراب

میری اُمید کی تصویر بنا بیٹھا ہے
ایک قطرہ جو لرزتا ہے سرِ برگِ گلاب

آدم و حوا کے اس ضبط کی تحسین کرو
سہہ گئے شان سے تنہائیِ جنت کا عذاب

میں روانہ ہوں تضادوں کے سفر پر کب سے
میرا ہر دن ہے حقیقت میں ، مرا یومِ حساب

(جون ۲۰۰۵ء)

O

دیکھے پت جھڑ میں بھی امکان بہار آنے کے
دورِ حاضر میں عجب طور ہیں دیوانے کے

وہ موحِّد ، جنہیں سجدے کی فضا ہی نہ ملی
راستے ڈھونڈ رہے ہیں کسی بت خانے کے

شاخ در شاخ اُڑی پھرتی ہیں بے بس چڑیاں
آندھیاں تنکے اُڑا لے گئیں کاشانے کے

روشنی پر تو لپکتا ہے ، پہ جلتا ہی نہیں
اس زمانے میں .دیئے بجھ گئے پروانے کے

(ستمبر۲۰۰۵ء)

O

میں محبت کے پَر لگاؤں گا
ایک دن تجھ کو ڈھونڈ لاؤں گا

تُو خفا ہے تو پھر خفا ہی سہی
میں تو ہر حال میں نبھاؤں گا

بھولنے کے کڑے سفر میں بھی
میں تجھے یاد کرتا جاؤں گا

زندگی میں بھی ، اور مر کر بھی
میں ترا مان ہی بڑھاؤں گا

لوگ غالبؔ کے شعر گاتے پھریں
میں ترا نام گنگناؤں گا

میں مسافر تو دُور کا ہوں ندیمؔ
میں مگر لَوٹ کر بھی آؤں گا

(اکتوبر ۲۰۰۵ء)

اے خدا!

اے خدا، دل تو آئینہ سا تھا
ٹھیس لگنے سے ٹوٹ سکتا تھا
اتنی ضربیں لگی ہیں پے در پے
میرا سب جسم کرچی کرچی ہے
آبگینے کی کیا حقیقت تھی
اتنی شدت کی کیا ضرورت تھی!

(اکتوبر ۲۰۰۵ء)

۸/اکتوبر۲۰۰۵ء

لکھوں تو کیا لکھوں!

کیسے لکھوں!

لفظوں کی ٹوٹی ہڈیوں کو کس طرح جوڑوں

سبھی روندے ہوئے حرفوں سے، نقطوں سے

جو پھوٹا پڑ رہا ہے جیتا جیتا خون

صفحۂ قرطاس پر چنگاریاں بن کر ٹپکتا ہے

زباں پگھلی پڑی ہے

اور اگر بولوں

تو لگتا ہے

مجھے چیخوں کے سوا کچھ بھی نہیں آتا

جنازوں پر یہاں زندہ جنازے سینہ زن ہیں
کچھ اگر باقی بچا ہے تو رگ و پے میں اُترتا درد ہے
قلب و جگر کو چیرتا دُکھ ہے

مجھے تو مرثیہ کہنا نہیں آتا
کچھ آتا ہے
تو ایسے المیے پر
اور عناصر کے مقابل اپنی فطری بے بسی پر
ٹوٹ کر رونا ہی آتا ہے
لکھوں تو کیا لکھوں!

(نومبر ۲۰۰۵ء)

کھٹک

درونِ آ گہی
یہ ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے——
خدائے لم یزل نے،
وہ جو باقی تھا، جو باقی ہے
جو باقی ہی رہے گا
روزِ اوّل سے
بھلا اولادِ آدم کی فنا کا
یہ تماشا
بے تحاشہ
کیوں لگایا ہے!

(جنوری ۲۰۰۶ء)

O

پڑے رہو وہیں کشتی کے ایک کونے میں
کہ وقت لگتا ہے برفاب کو بلونے میں

تلاشِ دوست کی جس کیفیت سے گزرا ہوں
وہ لطفِ خاص نہ ہنسنے میں ہے نہ رونے میں

قریب آتی ہوئی شامِ وعدہ کی سوگند
زمانے لگتے ہیں سورج غروب ہونے میں

مسلسل اُس کے خدوخال تکتا رہتا ہوں
کہ جیسے طفل کوئی ، محو ہو کھلونے میں

نہ کوئی سبزہ اُگا اور نہ کوئی پھول کِھلا
گزاری نصف صدی تخمِ اشک بونے میں

وہ جس کو پانے میں اک عمر کٹ گئی تھی ندیمؔ
پل ایک بھی تو نہ گزرا اُسی کو کھونے میں

(جنوری۲۰۰۶ء)

O

کچھ ایسی غضب ہوا چلی ہے
پھولوں پہ بھی دُھول اُڑ رہی ہے

دن دھوپ ہے، رات تیرگی ہے
اپنی تو سبھی سے دوستی ہے

اپنا قبلہ کبھی نہ بدلا
مجھ میں فقط اک یہی کمی ہے

احساسِ جمال سے ہے محروم
منعم کی یہی تو مفلسی ہے

اب جنسِ وفا کہاں ملے گی
یہ شمع تو کب کی جل بجھی ہے

میں چہرۂ شب کو پڑھ رہا ہوں
فن ایک عجیب روشنی ہے

(یکم فروری ۲۰۰۶ء)

فتح

نئے انسان کی تاریخ کے آغاز سے اب تک
حکومت کرنے والے
جس حقیقت کی نفی کے مُرتکب ہوتے رہے ہیں
وہ بس اتنی ہے
کہ لوگوں کے دِلوں کو جیتنا ہی فتح کی تکمیل ہوتا ہے

(اپریل ۲۰۰۶ء)

قطعات

گھنی رات کے دشتِ بے انتہا میں
میں اسرارِ فطرت کے گُل چن رہا ہوں
سکوت اتنا گمبھیر ہے نصف شب کا
فرشتوں کی سرگوشیاں سُن رہا ہوں

شکست آخرِکار مانی ہے شب نے
اندھیروں کے انبار جلنے لگے ہیں
اُفق بھیگنے لگ گیا روشنی میں
شعاعوں کے فوّارے چلنے لگے ہیں

وہ کیوں نہ آیا مرے خانۂ تباہ میں ، جب
درونِ سنگ بھی پہنچا ہے پالنے والا
تو کیوں نہ چاند سے پوچھیں کہ رات بھر جاگا
کہاں گیا مری راتیں اُجالنے والا؟

تغیّرات سے انکار تو نہیں ، لیکن
مجھے بتایا ہے گزرے ہوئے زمانوں نے
ازل کی حد سے نکل آئی کائنات مگر
نہ رنگ بدلا زمیں نے ، نہ آسمانوں نے

میں شہر سے تو بظاہر سفر پہ نکلا ہوں
مگر نہ سمت معیّن ، نہ کوئی جادہ ہے
مرے شعور نے وجدان کو یہ مژدہ دیا
ترا خُدا سے ملاقات کا ارادہ ہے

فردیات

انساں کو جنوں ہے جستجو کا
یہ سارا فساد ہے لہو کا

گو چار طرف فنا بپا ہے
انسان کی آرزو بقا ہے

حد کوئی نہ تھی مسافرت کی
میں اتنا چلا کہ تھک گیا تھا
ہے عشق مرا قدیم، لیکن
کل جیسے یہ واقعہ ہُوا تھا

شاعری منصبِ حق گوئی میں ناکام رہی
چیخ کو نغمہ بنانے کی رَوِش عام رہی

اس کے باطن میں بھڑک اُٹھتی ہے جب درد کی آنچ
پارۂ سنگ بھی ریزوں میں بدل جاتا ہے

بیٹھا ہو گا کہیں جُھوٹوں میں وہ جُھوٹا بن کر
کوئی سچا بھی اگر جُھوٹ کے اس دَور میں ہے
سر کٹا کر بھی سرافراز گنا جاتا ہوں
زندہ رہنے کا قرینہ مرے ہر طَور میں ہے
بزم کی بزم بھی تنہائی کی تنہائی بھی
میرے ہر دُکھ کا مداوا مرے لاہور میں ہے

عمر بھر دُھند میں کیوں ہم کو بھٹکنا ہوگا
غار سے پار نکلنے کا بھی رستہ ہوگا

کیوں صورتیں بُجھ گئی ہیں سب کی
آئینے بدل کے دیکھتے ہیں

کبھی کبھی تو ہوا ایسا رُخ بدلتی ہے
کہ ذرّے ذرّے کے سینے سے لَو نکلتی ہے
محبت ایک عجب شمع ہے درونِ ضمیر
اُسے جلاؤ تو پھر ساری عمر جلتی ہے

مجھ کو کبھی زوال سے رغبت نہ تھی ندیمؔ
سورج غروب ہوتا ہوا کیوں بھلا لگا!

تیرگی کی کبھی تکمیل نہ ہونے پائی
رات آئی پہ ستاروں کا چمکنا نہ گیا

کوئی دیوانہ گزرا ہے اِدھر سے
پڑا ہے ڈھیر سا زنجیرِ پا کا

یہ طنطنہ ، یہ رعونت ، یہ دبدبہ ، یہ غرور
یہی تو ہیں مرے گلشن اُجاڑنے والے

تجھ کو دیکھوں تو ہر اک چیز پہ پیار آتا ہے
اس قدر عشق سنبھالا نہیں جاتا مجھ سے
منہدم ہونے ہی والا ہے محبت کا محل
یہ کھنڈر اب تو اُجالا نہیں جاتا مجھ سے
تیر ہوتا تو کسی طور نکل ہی آتا
درد تو دِل سے نکالا نہیں جاتا مجھ سے

یہ سوچ سوچ کے سب زندگی گزاری ہے
کہ آج اُس کی ہے اور کل ہماری باری ہے
زمیں پہ آدم و حوّا کے ساتھ اُترا تھا
سو آنسوؤں کا یہ چشمہ ازل سے جاری ہے
بگولے رقص میں ہوتے ہیں جب تو سوچتا ہوں
کہ دشت پر بھی خُدا کا جمال جاری ہے

(۲۰۰۶ء)

ضرب اس کی بھی سخت کاری ہے
حق میں دشمن کے، اک دُعا ہی سہی
کھوکھلا ہو رہا ہے اس کا تنا
دیکھنے میں شجر ہرا ہی سہی

دن یوں کٹا کہ جیسے شبِ ہجر کٹ گئی
میں راستہ ہی تکتا رہا آفتاب کا
رنگ اپنے آپ ہی میں مگن رہ گیا مگر
آپے میں رہ سکا نہ تعطّر گلاب کا

میزانِ عدل ، صدرِ عدالت پہ آ گری
جب پیشہ ور بُروں کو بَری کر دیا گیا

سمندروں کی تہوں سے بُلا رہا ہے مجھے
وہ موج موج سفینہ اُچھالنے والا

جس پہ جو نقشِ قدم ہو، وہ فقط میرا ہو
صرف اتنی سی نئی راہ نکالی ہیں نے

سوانحی کوائف: احمد ندیمؔ قاسمی

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے، کہ ندیمؔ
میرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

نام: احمد شاہ

ادبی نام: احمد ندیمؔ قاسمی (اپنے پردادا ''محمد قاسم'' کی رعایت سے ''قاسمی'')

تخلص: ندیمؔ

تاریخِ ولادت: ۲۰، نومبر ۱۹۱۶ء

جائے پیدائش: انگہ (گاؤں)، وادیٔ سُون سکیسر۔ ضلع خوشاب (پنجاب۔ پاکستان)

قبیلہ: اعوان

آباؤاجداد: عرب سے ایران، اور ایران سے ملتان میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد میں تبلیغ کے سلسلہ میں خوشاب وادیٔ سون سکیسر میں تشریف لائے اور انگہ آباد کیا۔

والد کا نام: پیر غلام نبی عرف نبی چَن (وفات: ۱۹۲۳ء)

والدہ کا نام: غلام بیوی (وفات: ۱۹۵۶ء)

بہن، بھائی: بڑی بہن: سعیدہ بانو (وفات: ۱۹۶۰ء) جن کے اکلوتے بیٹے ظہیر بابر بطور صحافی اور افسانہ نگار مشہور ہوئے۔
بڑے بھائی: پیرزادہ محمد بخش (وفات: ۲۰۰۱ء)
(ایک بڑے بھائی اور ایک بڑی بہن کمسنی میں وفات پا گئے تھے)

سرپرست: ۸ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد مزید تعلیم و تربیت کیلئے اپنے چچا پیر حیدر شاہ صاحب کے پاس کیمبل پور (اٹک) آ گئے۔

شادی: ۶، جولائی ۱۹۴۸ء (قریبی عزیزوں میں ہوئی جو کہ وادیٔ سُون سکیسر کے ایک گاؤں مُسرّتی میں مقیم تھے۔)

رفیقِ حیات: رابعہ ندیم (پیدائش: ۱۹۳۰ء۔ وفات: ۱۹۹۲ء)

سعادتِ حج: ۱۹۸۸ء (بیگم بھی ہمراہ تھیں)

اولاد: دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔ (ڈاکٹر ناہید قاسمی (پ: ۱۹۴۹ء) نشاط ندیم (پ: ۱۹۵۱ء۔ و: ۱۹۹۵ء) نعمان ندیم قاسمی (پ: ۱۹۵۶ء))

نواسے، نواسیاں: نیّر، نفیسہ، نیلم اور ناموس (ناہید قاسمی) —— نوشین، خرم اور نوشابہ (نشاط ندیم)

پوتا، پوتیاں: نوین، نمود اور نایاب (نعمان ندیم قاسمی)

تعلیم: ۱۹۲۰-۲۱ء انگہ کی مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۵ء: چوتھی جماعت میں وظیفے کے امتحان میں ضلع بھر میں اوّل آئے۔

۱۹۲۶ء: گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل سکول کیمبل پور (اٹک)

۱۹۲۹ء: آٹھویں جماعت میں ریڈ کراس سوسائٹی کے منعقدہ مقابلۂ مضمون نویسی میں پنجاب بھر میں اوّل رہے۔

۱۹۳۱ء: گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے میٹرک پاس کیا۔

۱۹۳۱ء: پہلی شائع ہونے والی نظم، دورانِ میٹرک مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر نظم لکھی جو روزنامہ "سیاست" لاہور کے صفحہ اوّل پر شائع ہوئی۔

۱۹۳۱ء: صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخل ہوئے۔

۱۹۳۳ء: انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ تھرڈ ایئر میں تھے کہ سرپرست چچا کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۳۵ء: پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔

۱۹۳۵ء: ایم۔اے انگلش کیلئے گورنمنٹ کالج لاہور کی میرٹ لسٹ پر نام آ گیا تھا لیکن فیس نہ ہونے کی وجہ سے داخلہ نہیں لے سکے۔

ملازمت: ۱۹۳۶-۳۷ء: ریفارمز کمشنر لاہور میں بطور محرر تقرر۔

۱۹۳۹-۴۱ء: ایکسائز سب انسپکٹر، ملتان۔

۱۹۴۶-۴۸ء: ریڈیو پاکستان پشاور میں بحیثیت سکرپٹ رائٹر کام کیا۔

۸۸-۱۹۷۷ء: ''بزمِ اقبال'' کے اعزازی سیکرٹری۔

۲۰۰۶ء-۱۹۷۴ء: ڈائریکٹر مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور۔

ادارت: ۴۶-۱۹۴۲ء: ہفت روزہ ''پھول'' لاہور (بچوں کا رسالہ)

۴۶-۱۹۴۲ء: ہفت روزہ ''تہذیبِ نسواں'' لاہور (خواتین کا رسالہ)

۴۶-۱۹۴۳ء: ادبی ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' لاہور

۴۸-۱۹۴۷ء: رسالہ ''سویرا'' لاہور (ابتدائی چار شمارے)

۵۰-۱۹۴۸ء: رسالہ ''نقوش'' لاہور (ابتدائی دس شمارے)

۱۹۵۰ء: ماہنامہ ''سحر'' لاہور۔ (صرف ایک شمارہ)

۵۹-۱۹۵۳ء: روزنامہ ''امروز'' لاہور

۸۸-۱۹۷۷ء: رسالہ ''اقبال'' لاہور (اعزازی مدیر)

۲۰۰۶-۱۹۶۳ء: ادبی رسالہ ''فنون'' لاہور (آغاز سے تا عمر ۱۲۶ شمارے)

۲۰۰۶ء-۱۹۷۴ء: رسالہ ''صحیفہ'' لاہور

صحافت: ۱۹۵۲ء: روزنامہ ''امروز'' لاہور میں کالم ''حرف و حکایت''

۵۸-۱۹۵۳ء: روزنامہ ''امروز'' لاہور میں کالم ''پنج دریا''

۱۹۵۹ء: روزنامہ ''ہلالِ پاکستان'' میں ''موج در موج'' اور ''پنج دریا'' کے نام سے فکاہی کالم نویسی۔

۱۹۶۰ء: روزنامہ ''احسان'' لاہور میں کالم ''مطائبات''

۷۲-۱۹۶۴ء: روزنامہ ''امروز'' لاہور میں دوبارہ کالم ''عنقا'' کے نام سے لکھے۔ ساتھ ہی ادبی و تنقیدی مضامین ''تہذیب و فن'' کے عنوان سے لکھے۔

۱۹۷۰ء: روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں ''لاہور لاہور ہے''

روزنامہ ''حریت'' کراچی میں روزانہ فکاہی کالم ''موج در موج'' اور ہفتہ وار کالم ''لاہوریات''

۲۰۰۶ء-۱۹۷۲ء: روزنامہ ''جنگ'' لاہور میں کالم ''رواں دواں''

(آخری کالم وفات سے ۵ روز پہلے شائع ہوا۔)
اسکے علاوہ کئی اخبارات ورسائل میں مختلف عنوانات کے تحت کالم لکھے۔

نظر بندی: سیفٹی ایکٹ کے تحت مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء اور اکتوبر ۱۹۵۸ء تا فروری ۱۹۵۹ء

غیر ممالک کا سفر: چین، انگلستان، سکاٹ لینڈ، جرمنی، ناروے، امریکہ، کینیڈا، بھارت، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب اور سنگاپور وغیرہ۔

تصنیف وتالیف:

شاعری کے مجموعے: ۱) دھڑکنیں (قطعات) ــــ (۱۹۴۱ء)
۲) رم جھم (قطعات ورباعیات) ــــ (۱۹۴۴ء)
۳) جلال وجمال ــــ (۱۹۴۶ء)
۴) شعلۂ گل ــــ (۱۹۵۳ء)
۵) دشتِ وفا ــــ (۱۹۶۳ء)
۶) محیط ــــ (۱۹۷۶ء)
۷) دوام ــــ (۱۹۷۹ء)
۸) لوحِ خاک ــــ (۱۹۸۸ء)
۹) جمال (نعتیہ) ــــ (۱۹۹۲ء)
۱۰) بسیط ــــ (۱۹۹۵ء)
۱۱) ارض وسما ــــ (۲۰۰۶ء)

افسانوں کے مجموعے: ۱) چوپال ــــ (۱۹۳۹ء)
۲) بگولے ــــ (۱۹۴۱ء)
۳) طلوع وغروب ــــ (۱۹۴۲ء)
۴) گرداب ــــ (۱۹۴۳ء)
۵) سیلاب ــــ (۱۹۴۴ء)
۶) آنچل ــــ (۱۹۴۵ء)

۷)آبلے ـــــ (۱۹۴۶ء)

۸)آس پاس ـــــ (۱۹۴۸ء)

۹)درودیوار ـــــ (۱۹۴۹ء)

۱۰)سناٹا ـــــ (۱۹۵۲ء)

۱۱)بازارِ حیات ـــــ (۱۹۵۵ء)

۱۲)برگِ حنا ـــــ (۱۹۵۹ء)

۱۳)گھر سے گھر تک ـــــ (۱۹۶۳ء)

۱۴)کپاس کا پھول ـــــ (۱۹۷۳ء)

۱۵)نیلا پتھر ـــــ (۱۹۸۰ء)

۱۶)کوہ پیما ـــــ (۱۹۹۵ء)

۱۷)پت جھڑ ـــــ (زیرِ طبع)

تنقید:

۱)ادب اور تعلیم کے رشتے ـــــ (۱۹۷۴ء)

۲)تہذیب وفن ـــــ (۱۹۷۵ء)

۳)پس الفاظ ـــــ (۲۰۰۳ء)

۴)معنی کی تلاش ـــــ (۲۰۰۴ء)

۵)۵۰ سے زائد ادبی وتنقیدی مضامین (کتب زیرِ ترتیب وتدوین)

سوانحی خاکے:

۱)میرے ہمسفر ـــــ (۲۰۰۲ء)

۲)میرے ہمقدم ـــــ (۲۰۰۶ء)

۳)تذکرے ـــــ (زیرِ طبع)

ترتیب وتدوین:

۱)انگڑائیاں (مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب) ـــــ (۱۹۴۴ء)

۲)نقوشِ لطیف (خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب) ـــــ (۱۹۴۴ء)

۳)کیسر کیاری (انگریزی مضامین اور ڈراموں کے تراجم) ـــــ (۱۹۴۴ء)

۴)کیسر کیاری (منتخب فکاہی کالم) ـــــ (۱۹۹۹ء)

۵) منٹو کے خطوط بنام ندیم ــــ (۱۹۶۶ء)
۶) پاکستان کی لوک کہانیاں (ترجمہ) ــــ (۱۹۷۲ء)
۷) نذرِ حمید احمد خان (ترتیب) ــــ (۱۹۷۷ء)
ان کے علاوہ بھی مختلف کتب و رسائل تحریر اور مرتب کیے۔

بچوں کا ادب:
۱) آسمان کے گوشے میں (ڈرامے) ــــ (۱۹۴۳ء)
۲) دوستوں کی کہانیاں ــــ (۱۹۴۳ء)
۳) نئی نویلی کہانیاں ــــ (۱۹۴۴ء)
۴) نئی کہانیوں پر مشتمل دس تصویری کتب زیرِ طبع۔

کلیات:
۱) ندیم کی غزلیں ــــ (۱۹۹۱ء)
۲) ندیم کی نظمیں ــــ (۱۹۹۱ء)
۳) ندیم کے افسانے (خود منتخب کردہ ۴۰ افسانے) ــــ (۱۹۹۱ء)

اعزازات:
○ــــ ۳۷-۱۹۳۶ء: اوّل انعام اور گولڈ میڈل۔ (کل پاکستان مقابلۂ اُردو نظم بعنوان ''پیغامِ عمل'' بہ اہتمام انجمنِ حمایتِ اسلام (گولڈن جوبلی پر) بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے حاصل کیا۔)
○ــــ ۱۹۴۷ء: ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اعلان آزادی کے موقع پر ریڈیو پاکستان پشاور نے اپنے پروگراموں کا آغاز احمد ندیم قاسمی کے نغموں اور ترانوں سے کیا۔
○ــــ ۵۴-۱۹۴۹ء: انجمنِ ترقی پسند مصنفین پاکستان پر حکومت کی طرف سے بین لگائے جانے تک انجمن کے سیکرٹری جنرل رہے۔
○ــــ ۱۹۶۴ء: آدم جی ادبی ایوارڈ برائے ''دشتِ وفا''
○ــــ ۱۹۷۶ء: آدم جی ادبی ایوارڈ برائے ''محیط''
○ــــ ۱۹۷۹ء: آدم جی ادبی ایوارڈ برائے ''دوام''
ــــ: دوحہ ادبی ایوارڈ (یو-اے-ای)
ــــ: غالب ایوارڈ (دہلی، بھارت)
○ــــ ۱۹۶۸ء: پرائیڈ آف پرفارمنس
○ــــ ۱۹۸۰ء: ستارۂ امتیاز

- ۹۸-۱۹۹۷ء: کمالِ فن ایوارڈ
- ۱۹۹۹ء: نشانِ امتیاز
- ۲۰۰۲ء: اے آر وائی گولڈ ادبی ایوارڈ
- ۲۰۰۱ء: ''فیض محمد ٹرسٹ'' بھکر نے سال کی بہترین تخلیقات پر ''احمد ندیم قاسمی ایوارڈ'' کا اجراء کیا۔
- : فیچر فلموں ''دو راستے'' اور ''لوری'' کے مکالمے لکھنے پر سال کے بہترین مکالمہ نویس کے ''نگار ایوارڈ'' ملے۔
- : ملک اور بیرونِ ملک کے ٹی-وی چینلز ندیم کے متعدد افسانوں کو ڈرامائی تشکیل دے چکے ہیں۔
- :۲۳ مارچ یوم پاکستان کے حوالے سے پی ٹی وی لاہور کیلئے طویل منظوم فیچر لکھا۔
- : بہت سے ممالک اور بہت سی زبانوں میں ندیم کے فن پاروں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔
- : ندیم پر کئی غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔
- : ندیم کی شاعری پر حال ہی میں (مئی ۲۰۰۶ء) ''کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن- پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم ایف اے (پینٹنگ) کا تھیسز مکمل کیا جا چکا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کے متعلق کچھ کتب:

۱) ندیم نامہ (ترتیب: محمد طفیل اور بشیر موجد) ـــــ (۱۹۷۶ء)

۲) ندیم کی شاعری اور شخصیت (جمیل ملک)

۳) رسالہ ''افکار'' کراچی کا ندیم نمبر (مدیر صہبا لکھنوی) ـــــ (۱۹۷۵ء)

۴) احمد ندیم قاسمی ـــــ شاعر اور افسانہ نگار (پروفیسر فتح محمد ملک) ـــــ (۱۹۹۱ء)

۵) مٹی کا سمندر۔ (مرتب: ضیاء ساجد) ـــــ (۱۹۹۱ء)

۶) گل پاشی (مرتب: منصور آفاق۔ منصورہ احمد) ــــ (۱۹۹۶ء)

۷) رسالہ ''عبارت'' ندیم نمبر ــــ (۱۹۹۶ء)

۸) جریدہ ''عالمی اُردو ادب'' ندیم نمبر (مدیر: نند کشور وکرم) ــــ (۱۹۹۶ء)

۹) ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی (۲۰۰۲ء)

۱۰) احمد ندیم قاسمی۔ ایک لیجنڈ (ڈاکٹر شکیل الرحمٰن) ــــ (۲۰۰۳ء)

ــــ متعدد رسائل نے مختلف مواقع پر ندیم کیلئے گوشے مخصوص کئے۔

چند انگریزی تراجم:

1) Four contemporary poets (tr. by Daud Kamaal)

2) Selected poems of Ahmed Nadeem Qasmi (tr. by Baidaar Bakht & Parveen Shakir)

3) Selected Short Stories of Ahmad Nadeem Qasmi (Prof. Sajjad Sheikh) (1981)

4) Selected poems of Ahmed Nadeem Qasmi (Prof Sajjad Sheikh) (2004)

5) "The old Banyan and other stories" (Farooq Hasan) (2000)

6) Collected short stories of Ahmed Nadeem Qasmi (Prof Sajjad Sheikh) (underprint)

وفات: ۱۰، جولائی ۲۰۰۶ء (صبح) بوجہ: استھما، بمقام: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی، لاہور، پاکستان۔

تدفین: شاہ المشائخ قبرستان، ملت پارک، بمن آباد، لاہور، پاکستان۔

میں مَر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے رت نئے خاک کے مرے غبار سے بھی
(ندیم)

(مرتبین: نفیسہ حیات قاسمی، نیلم حیات قاسمی اور ناموس حیات قاسمی)

1916-2006

مزید کتابیں

- افسانے: خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے (احمد ندیم قاسمی)
- ندیم کی نظمیں (اوّل، دوم) (احمد ندیم قاسمی)
- ندیم کی غزلیں (احمد ندیم قاسمی)
- ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ (ڈاکٹر ناہید قاسمی)
- احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار (فتح محمد ملک)

Rs. 175.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1919-1
9789693519198